علم حدیث، اس کے امتیازات اور سننِ ترمذی

خطاب: ڈاکٹر محمود احمد غازی

ضبط وتحریر: مفتی محمد اصغر☆

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں منعقدہ تکملہ معارف السنن کی تقریب رونمائی سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے خصوصی خطاب فرمایا تھا، اسے جناب مفتی محمد زاہد کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ ادارہ

قابل صد احترام جناب صدرِ جلسہ

برادران مکرم محترم حضرت مولانا مفتی محمد طیب، حضرت مولانا مفتی محمد زاہد ادام اللہ بقاءکم۔

برادران محترم، علماءِ کرام!

سب سے پہلے میں اِن دونوں حضرات کا، حضرات شیخین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور یہ سعادت حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا کہ علماء وصلحا ایسی مبارک و بابرکت تقریب میں شریک ہوں جو ہر اعتبار سے سعادتوں سے پُر اور برکات سے مملو ہے۔ ایک ایسی کتاب کی تعارفی تقریب جس کی تکمیل کے انتظار میں کئی نسلیں گزر چکی ہیں اور یہ ایک طویل علمی روایت کی امین اور جامع ہے، یہ کتاب جس کو لکھنے کی توفیق مولانا مفتی محمد زاہد کو عطا ہوئی، ایک قدیم اور بڑی کتاب کو مکمل کرنے کی کام یاب کاوش ہے۔ لیکن یہ کتاب کیا ہے؟ اس کو لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس کتاب کے خصائص کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ذرا تفصیلی گفتگو کرنی پڑے گی، جس کو میں تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

ایک حصے میں طلبہ کی یاد دہانی کی خاطر، باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کے لیے ایک قدیمی اسلامی روایت کو اختصار سے پیش کرنے کی خاطر اور جو میرے جیسے طلبہ ہیں ان کے لیے

☆ جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

ایک تکرار کی خاطر مختصر طور پر چند سزائیں پیش کرتا ہوں، مدرسوں میں روایت ہے کہ طلبہ تکرار کرتے ہیں، جو طالب علم پڑھتا ہے صبح کو اُستاد سے، شام کو تکرار کرتا ہے، یاد کرتا ہے۔ آج صبح اسلام آباد سے روانگی سے قبل کا وقت میں نے اس تکملہ معارف السنن کے پڑھنے میں گزارا، اس کو تکرار سمجھیے، اس گفتگو کے تین حصے ہوں گے، پہلے حصے میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ خود علم حدیث کیا ہے؟ اس کی وسعت اور گہرائی کس نوعیت اور کس انداز کی ہے؟ اس کو دنیا کے تمام مذہبی علوم میں بالعموم اور علوم اسلامیہ میں بالخصوص کیا اہمیت حاصل ہے؟ اختصار کے ساتھ یہ گفتگو کا پہلا حصہ ہے۔ گفتگو کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جب علم حدیث کی تدوین پہلی دوسری صدی ہجری میں ہوئی تو اہم کتبِ حدیث کون کون سی ہمارے سامنے آئیں اور ان میں سے اِن چھ بڑی کتابوں کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا؟ یہ کتابیں صحاح ستہ کہلائیں؟ کیوں یہ کتابیں آج تک اُمتِ مسلمہ کے ہر دور میں، ہر علاقے میں اور ہر زمانے میں عقیدت واحترام، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، خدمت وتحقیق اور شرح وتفصیل کا موضوع رہی ہیں؟ دنیا کے جس گوشے میں بھی مسلمان پائے جاتے ہیں دنیائے اسلام سے باہر۔ وہ دنیائے مغرب ہو یا دنیائے مشرق، وہاں ان چھ کتابوں کو پڑھنے پڑھانے والے، ان کی خدمت کرنے والے کثرت سے موجود ہیں اور آج سے نہیں بلکہ پہلی صدی ہجری، جب سے یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اس وقت سے آج تک موجود ہیں، یہ وہ مقبولیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان چھ کتابوں کو عطا فرمائی ہے۔ جب سے یہ کتابیں لکھی گئیں اُس وقت سے اس مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں توسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تیسرے اور آخری حصے میں مَیں یہ بیان کروں گا کہ خود جامع ترمذی کی جس کی یہ شرح ہے خاص اہمیت کیا ہے؟ اس کی شرحیں جو ماضی میں لکھی گئیں ان میں کیا خصائص پائے جاتے ہیں اور وہ کون سے محرکات تھے جس کی وجہ سے برصغیر کے جید ترین اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد نے اس کتاب کی خدمت کو اپنی زندگی کا ایک اہم مشن قرار دیا، جس کی تکمیل کا پہلا قدم آج مولانا مفتی محمد زاہد صاحب نے نبھایا ہے۔

برادرانِ مکرم!

ہم حدیث اور سنت کی اصطلاحات سے واقف ہیں۔ میں اس فنی بحث میں نہیں جاتا کہ حدیث اور سنت میں فرق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا ہے؟ لیکن حدیث اور سنت کے نام سے جو

ذخائر مسلمانوں کے پاس موجود ہیں، جو علم بلکہ مجموعۂ علوم مسلمانوں کے پاس پایا جاتا ہے جس کی تدوین وارتقا اور توسیع میں انسانی تاریخ کے ہزاروں نہیں لاکھوں بہترین انسانوں نے مقدور بھر حصہ لیا ہے، وہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی منفرد علم ہے۔ اتنا منفرد علم کہ دنیا کی کسی قوم اور کسی تہذیب کے پاس اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے مذاہب ماضی میں بھی پیدا ہوئے، آج بھی دنیا میں کم از کم دو مذاہب ایسے ہیں جن کے ماننے والوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ یا اُن کے قریب قریب ہے۔ عیسائیوں کی تعداد قطعی طور پر مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ بدھسٹوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کی تعداد بھی مسلمانوں سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں سے کم تعداد رکھنے والے مذاہب بھی متعدد موجود ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک مذہب کے ماننے والے بھی اگر دیانت داری سے دعویٰ کرنا چاہیں تو دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس ان کے مذہب کی سب سے محترم شخصیت کے اقوال، فرمودات، طرزِ زندگی اور اُسوۂ حیات کے بارے میں وہ ساری تفصیلات موجود ہیں جو اس شخصیت کی پیروی کرنے کے لیے درکار ہیں۔ آج اگر ان میں سے کسی مذہب کے ماننے والے اپنی محترم شخصیت کی مکمل پیروی کرنا چاہیں تو اس پیروی کرنے کے کوئی اسباب ان کے پاس موجود نہیں ہیں۔ آج سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے مجھے ویٹی کن جانے کا اتفاق ہوا، ویٹی کن جو دنیائے عیسائیت کا بہت بڑا مرکز ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کا مذہبی دارالحکومت سمجھا جاتا ہے، رومن کیتھولک عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پاپائے اعظم جس کو دنیا کے عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا جانشین سمجھتی ہے وہ وہاں رہتا ہے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاپائے روم کو رومن کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی عقیدت کی رُو سے نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں ترمیم واضافے اور تنسیخ کا اختیار ہے بلکہ بائبل میں بھی نسخ اور تبدیلی کا اختیار ہے۔ وہ جب چاہے جس حد تک چاہے عہد نامہ جدید وعہد نامہ قدیم میں تبدیلی اور ترمیم وتنسیخ کر سکتا ہے، جب چاہے تاریخی حقائق کو بدل سکتا ہے، جب چاہے جو عقیدہ اور جو تعلیم عیسائیوں کے لیے واجب التعمیل قرار دینا چاہے وہ قرار دے سکتا ہے۔ اِس سے آپ اندازہ کریں کہ رومن کیتھولک دُنیا میں اس کا احترام کتنا ہو سکتا ہے، کتنی اہمیت اس شخص کو حاصل ہے۔ ۱۹۸۱ء کے جولائی میں مجھے ویٹی کن جانے کا اتفاق ہوا، مجھے ایک وفد کے ساتھ دعوت دی گئی تھی جو پاکستان کے چند نامور علماء پر مشتمل تھا اور اس وفد کو پوپ پال ششم سے ملاقات کرنا تھی،

لیکن وفد یہاں سے روانہ ہوکرایک تیسرے ملک پہنچا تو معلوم ہوا کہ پوپ پال پر کسی نے حملہ کر دیا ہے اور وہ زخمی ہوگیا ہے اور ہسپتال میں داخل ہے، چناں چہ روم پہنچنے کے بعد پوپ پال سے تو ملاقات نہ ہوسکی لیکن جو سینئر ترین کارڈینل انتظامی معاملات میں ان کی جانشینی کر رہے تھے، ان کی جگہ ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے اُن سے ملاقات کا موقع ملا اور ان سے ایک لمبی تفصیلی گفتگو ہوئی جس کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں، لیکن میں نے اُن سے یہ پوچھا کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانشین سمجھے جاتے ہیں، میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انتہائی احترام کرتا ہوں، اُن سے مجھے بڑی عقیدت اور محبت ہے، اُن پر ایمان میرے مسلمان ہونے کے لیے لازمی ہے۔ اگر ان کی شخصیت اور نبوت پر میرا ایمان ذرہ برابر کم زور ہو جائے تو میرے ایمان میں شک پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے میرا دل چاہتا ہے کہ آپ جو ان کے جانشین ہیں، آپ کی زبان سے کوئی ایسا لفظ سنوں، کسی بھی زبان میں ہو، سریانی میں ہو یا عبرانی میں ہو یا قدیم یونانی میں ہو۔ یہ تین زبانیں مشہور ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بولی جاتی تھیں۔ عیسائی دنیا آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ وہ ان میں سے کون سی زبان بولتے تھے، آج تک مسیحی مؤرخین یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک کون سی تھی، ان میں سے کون سی زبان میں گفتگو فرماتے تھے، تو آپ جس زبان میں چاہیں مجھے ایک جملہ بول کر بتائیں جس کے بارے میں آپ کو سو فیصد یقین ہو کہ ان کی زبان مبارک سے اسی طرح نکلا تھا۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ میں سوال سمجھا نہیں۔ واقعی نہیں سمجھے یا جواب ذہن میں نہیں آیا اس لیے اس کے دہرانے کے لئے کہا، میں نے ایک گُر یہ بھی سیکھا ہے کہ اگر کسی سوال کا فوری جواب ذہن میں نہ آئے تو سوال کو دہرانے کے لیے کہتے ہیں کہ آپ دوسرے الفاظ میں بات کہیں اور بعض بڑے ممالک کے، غلام ممالک کے نہیں بعض آزاد ممالک کے ذمے دار حضرات مترجم ساتھ بٹھاتے ہیں، انگریزی انتہائی بہتر جاننے کے باوجود جو ہمارے حکمرانوں سے بہت اعلیٰ انگلش جانتے تھے تو وہی مترجم ساتھ بٹھاتے تھے کہ جب سوال کرنے والا سوال کرے، مترجم ترجمہ کرے اِس دوران میں وہ جواب سوچ لیں تو ان کو صحیح جواب دینے میں سہولت ہو جائے۔ چنانچہ شاید اسی لیے انہوں نے مجھے سوال کو دہرانے کے لیے کہا، جب میں نے دو تین مرتبہ واضح طور پر سوال دہرایا تو انہوں نے فرانسیسی زبان میں کہا کہ ممکن نہیں ہے۔ ایسا کوئی جملہ ان کے لیے بیان کرنا،

ایک لفظ بھی بیان کرنا ممکن نہیں ہے جس کے بارے میں وہ سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ لفظ اسی طرح، ان ہی الفاظ میں اور اسی زبان میں نکلا تھا۔ یہی حال دنیا کے اس جیسے مذاہب کے ماننے والوں کا ہے۔ آج وہ زبانیں مٹ چکی ہیں، آج وہ ادبیات دنیا سے ختم ہوچکی ہیں جو ان کے زمانے میں پائی جاتی تھیں۔ آج ان کے زمانے کی لکھی ہوئی کوئی تحریر موجود نہیں۔ آج کوئی ایسا آدمی دنیا میں موجود نہیں ہے جو ایک علمی قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ یہ کتاب جو فلاں شخصیت سے منسوب ہے یہ اس کے شاگرد یا اس کے تربیت یافتہ یا اس کے ساتھی یا حواری یا صحابی کی لکھی ہوئی ہے یا لکھوائی ہوئی ہے یا کم از کم یہ بتا سکے کہ فلاں شخص نے فلاں علاقے میں بیٹھ کر اس کو لکھا تھا۔

حدیث کے طلبہ موضوع حدیثوں کے واقف ہیں۔ موضوع حدیث ایک اصطلاح ہے۔ اسے حدیث مجازاً کہہ دیا جاتا ہے، یعنی وہ بیان جو غلط طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کردیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بات نہ فرمائی ہو، اس پر الگ سے کتابیں محدثین نے لکھی ہیں۔ موضوع احادیث کے الگ مجموعے مرتب کردیئے ہیں تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ بیانات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں پوری دیانت داری کے ساتھ اور علماء کے سامنے اس کا اظہار کرنے میں کوئی تأمل نہیں سمجھتا کہ تاریخی ثبوت کے اعتبار سے مسلمانوں کی موضوع احادیث کا درجہ دنیا کی بقیہ تمام مذہبی کتابوں سے اونچا ہے۔ کم از کم ایک موضوع حدیث کے بارے میں مَیں یہ تاریخی طور پر بتا سکتا ہوں کہ فلاں شخص عبد الکریم بن ابی العوجاء نے بغداد میں بیٹھ کر اسے عربی زبان میں گھڑا تھا۔ عبد الکریم بن ابی عوجاء ایک مشہور وضّاع تھا جس نے بہت ساری جھوٹی حدیثیں وضع کی تھیں۔ وہ کون تھا؟ بغداد میں رہنے والا تھا کب مرا، کب پیدا ہوا؟ تاریخی طور پر ایک متعین شخصیت ہے، لہٰذا اس کا تاریخی ثبوت موجود ہے، اس کے لکھنے والے کا بھی، جہاں بیٹھ کر اس نے وہ حدیثیں مرتب کیں وہ بھی موجود ہیں، وہ زبان آج تک موجود ہے، وہ زبان بولی جاتی ہے اور کوئی شک نہیں کرسکتا کہ یہ حدیث عبد الکریم بن ابی عوجاء نے گھڑی ہے۔ دیگر مذہبی کتابوں کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کو پہلے پہل کس نے لکھا، وہ شخص ان کتابوں کو مانتا بھی تھا یا نہیں، ان شخصیات پہ ایمان بھی رکھتا تھا یا نہیں رکھتا تھا؟ بدھ مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ مسیحیت کا یہی حال ہے۔ عہد قدیم کی کتابوں کا بھی یہی حال

ہے۔ خود مغربی دنیا میں بے شمار بحثیں ہیں، کتابیں اس پر لکھی گئی ہیں، مؤرخین نے باقاعدہ تحقیق کر کے لکھی ہیں کہ کیا موسیٰ علیہ السلام کسی شخصیت کا نام تھا یا ویسے ہی کسی فرضی شخصیت کے نام سے قصے مشہور ہیں۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام واقعی کوئی تاریخی شخصیت تھے یا ویسے ہی کوئی شخصیت مشہور ہوگئی جیسے برہما، رام چندر جی اور کرشن جی۔ کچھ نہیں معلوم یہ واقعی شخصیتیں تھیں یا فرضی لوگ ہیں؟ اس طرح کے سوالات ہر مذہبی شخصیت کے بارے میں پیدا ہوئے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑے سے بڑا دشمن بڑے سے بڑا، مخالف جس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دربار میں سب وشتم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو، وہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہے کہ محمد بن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک تاریخی شخصیت تھے، جو مکہ مکرمہ میں جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر میں پیدا ہوئے، فلاں سَن میں پیدا ہوئے، فلاں سن سے فلاں سن تک مکے میں رہے، فلاں سن میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور فلاں سن میں دنیا سے تشریف لے گئے۔ سیرت مبارکہ کے جتنے اہم اور بڑے واقعات ہیں وہ سب تاریخی طور پر ثابت ہیں، کوئی دشمن اور مخالف بھی اِس کا انکار نہیں کرسکتا۔ ہمارے اے۔ کے بروہی صاحب مرحوم کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تاریخ کے سرچ لائٹ میں ہے، جیسے سرچ لائٹ اوپر سے ڈالی جارہی ہو تو ایک ایک ذرہ روشن ہوتا ہے، اسی طرح اگر تاریخ کی سرچ لائٹ سے جائزہ لیا جائے تو صرف ایک شخصیت نظر آئے گی اور وہ جناب محمد بن عبداللہ علیہ السلام کی ہے۔ وہ تمام ذخائر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں مرتب ہوئے، ان کے مجموعے کو علم حدیث کہا جاتا ہے۔

علم حدیث کے بارے میں بہت سے لوگوں کا یہ غلط خیال پیدا ہوگیا ہے، جس کو بعض منکرین حدیث نے تقویت دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی احادیث مبارکہ کا ذخیرہ اس تیقن اور قطعیت کے ساتھ موجود نہیں ہے جس قطعیت اور تیقن کے ساتھ قرآن پاک موجود ہے، یہ بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ میں ابھی اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ جس تسلسل، جس تیقن، جس تواتر سے قرآن پاک ہم تک پہنچا ہے اسی تیقن، اسی تواتر اور قطعیت و تسلسل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہم تک پہنچی ہے۔ جس لمحے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل ہوا، قرآن پاک کی آیت نازل ہوئی کہ نماز قائم کرو، اسی لمحے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز سکھائی اور ہزاروں صحابہ کرام نے اسی وقت اسی طرح نماز پڑھنا

شروع کردی صلوا کما رأیتمونی أصلی کے تحت ہزاروں صحابہ کرام کو دیکھ کر لاکھوں تابعین نے نماز شروع کردی۔ تابعین نئے نئے آتے گئے اسلام میں داخل ہوتے گئے، صحابہ کرام کی زیارت کرتے گئے نماز سیکھتے گئے، لاکھوں تابعین کو دیکھ کر دسیوں لاکھوں تبع تابعین نے نمازیں سیکھ لیں۔ یہ ایک مثال ہے کہ سنت نسلاً بعد نسل منتقل ہوئی پوری ایک نسل نے دوسری کو، دوسری نے تیسری کو، تیسری نے چوتھی کو یہ سنت منتقل کی تا آں کہ وہ ہم تک پہنچی، ہم میں سے ہر شخص الحمدللہ نماز کا پابند ہے۔ ہم میں سے کسی نے کسی فقہ یا حدیث کی کتاب میں دیکھ کر نماز پڑھنا نہیں سیکھا۔ نماز دوسروں کو دیکھ کے سیکھی ہے۔ والدین کو دیکھا، اساتذہ کو دیکھا، بڑے بھائیوں کو دیکھا، نو مسلموں نے پہلے سے مسلموں کو دیکھا اور نماز شروع کردی، تاں آں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تک یہ سارا سلسلہ اس طرح مربوط اور غیر منقطع ہے کہ اس میں ایک لمحے اور ایک ثانئے کا توقف بھی موجود نہیں ہے۔

پھر علم حدیث کی وسعت اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے میں حضور علیہ السلام کی ہدایات اور رہنمائی واضح طور پر، زبانِ مبارک کے ارشادات کے ذریعے، طرزِ عمل کے ذریعے، صحابہ کرام اور نسل انسانی کی تربیت کے ڈھنگ اور انداز سے جو نقل ہوئے ہیں ان کے ذریعے ہم تک نہ پہنچی ہوں، ان تینوں ذرائع سے یعنی سنت قولی، سنت فعلی اور سنت تقریری، ان تینوں ذرائع سے جو ذخائر ہدایت اور رشد و ہدایت کے سرچشمے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں ہدایات موجود نہ ہوں، انسان کے پاس جو نعمت ہو اس کی قدر نہیں ہوتی، اپنے پاس نعمت ہو تو قدر نہیں ہوتی، جب وہ نعمت خدانخواستہ زائل ہو جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ کیا نعمت زائل ہوگئی! آج بہت سے حضرات کا آپ نے بھی سنا ہوگا آئندہ بھی سنیں گے احادیث پر اسی نوعیت کے اعتراضات کرتے ہیں جو یہودی پہلے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ایک یہودی نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ تمہارے پیغمبر تمہیں ہگنے موتنے کا طریقہ بھی سکھلاتے ہیں۔ ظاہر ہے طنز مقصود تھا، مضحکہ مقصود تھا۔ تمسخر اڑانا مقصود تھا۔ اس لیے کہ احادیث میں یہ احکام بھی آئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز کی تعلیم دی ہے جو انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے معلوم نہیں کرسکتا ہے، جو چیز انسان تجربے اور مشاہدے سے معلوم کرسکتا ہے اس کے لیے اللہ کو پیغمبر کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ

نے پیغمبر اسی کام کے لیے بھیجے ہیں جہاں انسان کی عقل، مشاہدہ یا تجربہ اس کو غلط راستے پر ڈال سکتا ہے۔ اس لیے ایسے انسان آج بھی موجود ہیں، جن کی پاکیزگی اور صفائی کے معیار سے آپ واقف ہیں۔ اس کی مثالیں بیان کر کے میں محفل کو مکدر کرنا نہیں چاہتا۔ صفائی اور پاکیزگی کے نہ ہونے کی وجہ سے انسانوں میں کس حد تک گندگی اور نجاست پیدا ہوتی ہے، یہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے ہمارے قرب وجوار میں، ہمارے پڑوس میں جانوروں کی غلاظت کو متبرک سمجھنے والے موجود ہیں، ممکن ہے ہمارے اس ملک میں بھی کچھ موجود ہوں، تو آج اکیسویں صدی تک جانوروں کی غلاظت کو متبرک سمجھنے والے موجود ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بعض معاملات بدیہی ہونے کے باوجود انسانی عقل وہاں دھوکا کھا سکتی ہے، اگر انسانی عقل دھوکا نہ کھاتی تو یہ غلاظت کو متبرک اور مقدس نہ سمجھتے۔ یہ تو ان کا حال ہے جو زیادہ مہذب نہیں ہیں، جو زیادہ مہذب ہیں ان سے واسطہ ان کو پڑا ہوگا جن کو بار ہا باہر جانے کا موقع ملا ہوگا، اس لیے میں مزید مثالیں نہیں دینا چاہتا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اس نے اعتراض کیا کہ تمہارے نبی فلاں فلاں چیزیں بھی سکھاتے ہیں۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا: جی ہاں! انہوں نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے، یہ تعلیم دی ہے اور یہ تعلیم دی ہے۔ گویا یہ اعتراض کہ چوں کہ علوم حدیث میں اور ذخائرِ حدیث وسنت میں ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات بتائے گئے ہیں، لہٰذا یہ معاملات زبانِ نبوت سے صادر نہیں ہو سکتے۔ یہ غلط فہمی سب سے پہلے یا یہ شبہ سب سے پہلے یہودیوں کے دماغ کی پیداوار ہے اور آج تک بعض ایسے لوگ بھی اس کو دہراتے چلے آرہے ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ چھوٹے سے چھوٹے خالص شخصی معاملے سے لے کر اور بڑے سے بڑے بین الاقوامی معاملات تک سنتِ رسول اور حدیث کے ذخائر میں راہ نمائی اور ہدایات موجود ہیں۔

آج بین الاقوامی قانون میں ایک بہت اہم شعبہ ہے جس کو انٹرنیشنل ہیومنٹرئن لا (International Humanitasian Law) یعنی بین الاقوامی انسانی قانون جس کو کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ کسی جنگ سے متاثر ہوں، کسی جنگ کے نتیجے میں زخمی ہو جائیں، بے گھر ہو جائیں، بے سہارا ہو جائیں یا کسی وجہ سے اس سے متاثر ہوں ان کے حقوق کو کیسے پامال ہونے سے بچایا جائے، ان کو کیسے جنگ کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اس کے لیے قانون سوچا گیا اور پچھلے ۸۰، ۹۰ سال میں مغرب میں اس پر غور وخوض ہوا، بہت سارے قوانین مرتب ہوئے،

بہت سارے معاہدے ہوئے اور اہلِ مغرب بہت فخر کے ساتھ اس کو بیان کرتے ہیں۔ مغرب سے انٹرنیشنل ہیومنٹیرین لاء پر جو کتابیں آتی ہیں، اس میں انتہائی فخر کے ساتھ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم نے انسانیت کو پہلے پہل یہ تصورات دیئے ہیں، لیکن حدیث کی کوئی کتاب اٹھالیں مؤطا امام مالک سے لے کر اور بقیہ تمام کتابوں تک کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس میں وہ سارے احکام موجود نہ ہوں جو آج انٹرنیشنل ہومنٹیرین لاء میں طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کس پر حملہ کیا جائے کس پر نہ کیا جائے؟ جنگ میں ہتھیار کس کو بنایا جائے اور کس کو نہ بنایا جائے؟ جو لوگ جنگ میں حصہ نہیں لے رہے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو جو ہدایات دیں اس معاملے میں وہ کیا ہدایات ہیں۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب بارہ فوجیں بھیجیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے فوراً بعد، ان بارہ فوجوں کے بارہ کمانڈروں کو ایک ہدایت نامہ جاری کیا، جو حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہے۔ اس میں وہ ساری تفصیلات موجود ہیں جس کی مختلف صورتیں آج بین الاقوامی انسانی قانون میں بیان کی جاتی ہیں۔ گویا ذخائر حدیث میں اتنی جامعیت، شمول اور عموم پایا جاتا ہے کہ خالص انفرادی صفائی کے معاملات سے لے کر جو انسان تنہا کرتا ہے کمرے میں اندر بند ہو کر وہاں سے لے کر اور بین الاقوامی معاملات کے تازہ ترین تصورات تک ہر چیز علم حدیث اور اصول حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ پھر علم حدیث میں مسلمانوں کی تہذیب، مسلمانوں کی علمی روایت اور علوم وفنون کو ایسی ایسی نئی جہتیں عطا فرمائیں جن سے دوسری اقوام طویل عرصے تک ناواقف رہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں میں تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا، مثال کے طور پر عربوں میں سوائے اس کے کہ مختلف قبائل اپنے بہادری کے قصے یاد رکھتے تھے جن کو ایام العرب کہا جاتا تھا اور ان کا م یابیوں کو قصائد میں لکھا جاتا تھا۔ عمرو بن کلثوم کا قصیدہ آپ نے پڑھا ہوگا اور عنترہ کے قصائد پڑھے ہوں گے، جس میں اپنے قبیلے کی بہادری کی داستانیں ہیں، ان دو چیزوں کے علاوہ عربوں کے پاس تاریخ کا کوئی تصور نہیں تھا، ایام العرب یا رزمیہ قصائد۔ رزمیہ قصائد سے ادب کا ہر طالب علم واقف ہے کہ اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہوتا ہے، کتنا مبالغہ ہوتا ہے۔ عربوں سے باہر تاریخ نویسی کیا تھی وہ کتابوں کا جائزہ لے لیں جو آج موجود ہیں، ہندوؤں کی کتابیں موجود ہیں، اس میں کتنی تاریخ ہے، کتنا افسانہ ہے، کتنی خرافات

ہیں۔اس کی مثالیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں،لیکن ایک مثال سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ (تاریخ) کس نوعیت کی ہے۔اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب راون کی اپنے مخالف سے لڑائی ہوئی تو پورے روئے زمین کو،کرۂ ارض کو ایک بندر نے اپنے سر پہ رکھا تھا،اس نے یوپی سے چھلانگ لگائی اور سری لنکا پہنچ گیا۔سب اس میں لکھا ہوا ہے،ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔اب یہ کیسے ہوسکتا ہے روئے زمین کو اٹھائے ہوئے بندر نے یوپی سے چھلانگ لگائی اور سری لنکا چلا گیا۔اس کے علاوہ ان سے پہلے کی جو تاریخیں ہیں،ان کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا لکھنے والا کون تھا؟اس نے کب لکھا؟اس کے واقعات کا مأخذ کیا تھا،مقصد کیا تھا،کس سے سُن کے لکھا؟وہ شاہد تھا یا نہیں تھا؟اگر عینی شاہد نہیں تھا تو کیا عینی شاہد تک اس کو رسائی تھی؟یہ سب تصورات ان کے ہاں آج بھی موجود نہیں۔

علمِ حدیث نے سب سے پہلے مسلمانوں کی یہ تربیت کی کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو مکمل صداقت اور حقائق کے ساتھ بیان کرو۔یہ ایک گواہی ہے جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے تم دے رہے ہو۔إذا رأیت مثل الشمس فاشھد،جب تک اس طرح نہ دیکھو جیسے نصف النہار میں سورج کو دیکھ رہے ہو اس وقت تک کسی چیز کی گواہی مت دو۔نہ کسی واقعے کی گواہی دو،نہ کسی کے مقدمے میں گواہی دو۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک ایسی روایت میں جنم لیا جس سے علمِ حدیث کے طلبہ تو واقف ہیں لیکن بہت سے لوگ شاید واقف نہ ہوں،وہ ہے علم اسناد،کہ کوئی بات بغیر مکمل سند کے بیان نہ کی جائے،آج میں آپ کے سامنے الحمدللہ بتا سکتا ہوں کہ کوئی حدیث مثلاً إنما الأعمال بالنیات ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''،سب نے سنا ہوگا،میں اپنے سے لے کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سند بیان کرسکتا ہوں،کہ یہ حدیث مجھ تک کیسے پہنچی؟جن شخصیتوں کے میں نام لوں گا ان میں کوئی غیر تاریخی شخصیت نہیں ہے۔ہر شخصیت کے بارے میں تاریخ میں مواد موجود ہے۔کتب خانے میں بیٹھنا پڑے گا اور تین چار گھنٹے لگیں گے،ہر دور کے علیحدہ علیحدہ ناموں کو بیان کرنے میں اور میں ہر شخص کے بارے میں یہ بتانے کا بھی پابند ہوں کہ اس کا حافظہ کیسا تھا؟اس کا کردار کیا تھا؟یہ سچا تھا کہ جھوٹا تھا،اس نے یہ حدیث کس استاد سے حاصل کی اور کہاں بیٹھ کر حاصل کی،زبانی سنا تھا یا تحریری سنا تھا،جب سنا تھا اُستاد بول رہے تھے یہ لکھ رہے تھے یا یہ پڑھ کے سنا رہے تھے اور استاد

سماع کر رہے تھے۔ان میں سے ہر چیز کا ریکارڈ آج موجود ہے، اس وقت بھی موجود ہے۔ یہ بات جس قوم کی تربیت کا حصہ بنی پھر وہ تاریخ وہاں تاریخ اور ادب وشعر، صرف ونحو حتی کہ قصے کہانیاں اور حکایت بھی بغیر سند کے سنانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

ابھی کچھ طلبہ میرے پاس آئے اور وہ پوچھ رہے تھے کہ عربی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کیا کریں؟ میں نے اُن سے کہا اگر وقت ہو تو کتاب الاغانی ایک کتاب ہے اس کا مطالعہ کریں، جس میں بھانڈوں کے، گویوں کے، فضول لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، زبان بہت اعلیٰ ہے، چوتھی صدی ہجری میں ایک شخص نے لکھی تھی، بڑا مشہور ادیب تھا، اس میں جھوٹ سچ سب کچھ لکھا ہوا ہے، جیسے کہانیوں میں ہوتا ہے۔ شیخ چلی کی کہانیاں جیسے ہوتی ہیں۔ سننے والے کو بھی پتا ہے کہ جھوٹ ہے، پڑھنے والے کو بھی پتا ہے کہ جھوٹ ہے، لیکن ادبی دل چسپی سے بچے بھی سنتے ہیں بڑے بھی سنتے ہیں۔ ابوالفضل اصفہانی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں لکھی جس میں سند نہ بیان کی ہو، مجھ سے فلاں بھانڈ نے بیان کیا، اُس سے فلاں گویے نے بیان کیا، اس سے فلاں بھانڈ نے بیان کیا، اس سے فلاں نے بیان کیا، یہ بات یوں ہوئی تھی۔ اب بہ ظاہر آج یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن اِس سے مسلمانوں کے اس مزاج کا اندازہ کرنا مقصود ہے کہ کوئی لطیفے کی بات بھی، جھوٹ، لغو اور مہمل بات بھی، جس کی لطیفے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے، مسلمانوں نے سند کے بغیر بیان نہیں کی۔ یہ علم حدیث کی دَین ہے۔ جب علم حدیث نے یہ تربیت پیدا کر دی تو جو تاریخ نویسی مسلمانوں میں پیدا ہوئی اُس تاریخ نویسی کا دنیا میں کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آج دنیا کی کسی قوم کے پاس بھی تاریخی معلومات موجود نہیں ہیں جو مسلمانوں کے پاس موجود ہیں۔ پچھلے دو اڑھائی سو سال کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو بلندیوں کی اس معراج پر ہے جہاں کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام احترام وتقدس کے اس معیار پر ہیں کہ ایک عام مسلمان شاید اس کا تصور بھی نہ کر سکے، لیکن جو بہت نچلی شخصیتیں ہیں ان کے بارے میں جو معلومات موجود ہیں صرف اس کا اندازہ اگر کرنا چاہیں تو علم رجال سے کریں۔ ایک مشہور مستشرق نے اس کا اعتراف کیا کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپ کے اقوال وارشادات کو محفوظ رکھنے کی خاطر چھ لاکھ انسانوں کے اقوال اور کردار کو محفوظ رکھا۔ چھ لاکھ انسانوں کی سوانح عمریاں اس لیے محفوظ کیں کہ یہ چھ لاکھ انسان وہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور ارشادات کو نقل کیا ہے۔ صحابہ کرام میں سے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ان کی تعداد تو ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے، لیکن جن شخصیتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد گرامی منقول ہے ان کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے، ان کے تذکرے علمائے کرام نے لکھے اور کچھ حضرات نے پوری زندگی اس کام کے لیے صرف کردی کہ صحابہ کرام کے حالات کو جمع کریں۔ آج بڑے بڑے مجموعے جن کو آپ انسائیکلوپیڈیا کہہ سکتے ہیں دس دس، بارہ بارہ، پندرہ پندرہ جلدوں میں موجود ہیں جن میں صرف صحابہ کرام کا تذکرہ ہے۔ جن میں صرف حدیث کے راویوں کا تذکرہ ہے، وہ کتابیں تو پچاس پچاس جلدوں میں ہیں، پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ جلدوں کی ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں صرف راویانِ حدیث کی تفصیل ہے، پھر جب اس میں تخصص پیدا ہوا، وسعت پیدا ہوئی تو ایسی کتابیں تیار ہونا شروع ہوئیں کہ فلاں شہر میں راویانِ حدیث گئے ان کے حالات اس میں درج ہیں۔ ایک کتاب مجھے بہت پسند ہے، میں اسے وقتاً فوقتاً پڑھتا بھی رہتا ہوں، بہ ظاہر زندگی میں پوری کتاب کو پڑھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا، ایک محدث تھے ابن عساکر، انہوں نے دمشق کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی، تاریخ سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ جیسے عام دمشق کی تاریخ ہوتی ہے اس طرح کی کتاب ہے، بلکہ مراد یہ ہے دمشق میں جتنے صحابہ کرام گئے، دمشق میں تابعین تشریف لائے، دمشق میں جتنے تبع تابعین تشریف لائے، دمشق میں جتنے ائمہ مجتہدین آئے، ائمہ فقہا آئے، شاعر آئے، قاضی آئے، ان سب کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب بہت ضخیم ہے اور آج سے کوئی چھ آٹھ سال پہلے مجھے دمشق جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ایک بہت بڑا ادارہ ہے **مجمع اللغة العربية**، الحمدللہ میں بھی اس کا ممبر ہوں، میرے استاد اور ہمارے برصغیر کے مشہور محدث جن کی کتاب کا یہ تکملہ ہے حضرت مولانا یوسف بنوریؒ بھی اس کے ممبر تھے، وہاں یہ کتاب (تاریخ ابن عساکر) شائع ہو رہی ہے اور ایک محترم خاتون اس کو ایڈیٹ کر رہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میں اس وقت تک اسّی جلدیں ایڈیٹ کر چکی ہوں اور پوری کتاب ایک سو بیس جلدوں میں مکمل ہوگی۔ ایک سو بیس جلدوں کی ایک کتاب صرف اس تفصیل پر ہے کہ دمشق میں آنے والے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، راوی، محدثین، مجتہدین، فقہاء کون کون تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم حدیث کی وسعت کس نوعیت کی ہے اور اس نے تاریخ پر کیسے اثر ڈالا۔

علم حدیث کی گود میں علم فقہ پیدا ہوا، علم فقہ کیا ہے؟ حدیث اور قرآن کی فہم عمیق کا نام فقہ ہے، جنہوں نے قرآن وحدیث میں اس نکتے سے غور کیا اور فہم عمیق سے کام لیا کہ اس سے زندگی بسر کرنے کے کون کون سے احکام نکلتے ہیں وہ فقہا کہلائے، شروع میں، محدثین اور فقہا ایک ہی تھے۔ امام مالک فقیہ بھی تھے محدث بھی تھے، امام شافعی فقیہ بھی تھے محدث بھی تھے، پھر ہر قوم میں ہوتا ہے تخصصات میں شعبے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔علوم وفنون برانچ آوٹ (Branch out) ہوتے جاتے ہیں۔علم حدیث میں علم روایت الگ ہوا، درایت الگ ہوا، رجال الگ ہوا، جرح وتعدیل الگ ہوئی، مصطلح الگ ہوئی، ایک ایک کر کے شعبے بنتے گئے، اسی طرح علم حدیث اور فقہ بھی الگ الگ ہو گئے، تو فقہ اب جو ایک مکمل اور متکامل فن ہے جس کا دنیا کے کسی بھی نظامِ قانون سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، جو اپنی گہرائی اور وسعت میں دنیا کے تمام قانونی نظاموں سے ممتاز اور ممیز ہے، جس کی امتیاز کی تفصیل بیان کی جائے تو بہت طویل وقت درکار ہوگا، وہ علمِ حدیث کی گود میں پیدا ہوا۔

علمِ کلام یعنی اسلامی عقائد کو خالص عقلی استدلال سے کیسے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، یہ محدثین کے ہاتھوں سامنے آیا، وہ بنیادی کلامی مسائل جن کی وجہ سے علم کلام کا نام علم کلام ہوا کہ کلام اللہ کی اصل حیثیت کیا ہے؟ کلام اللہ کا رتبہ کیا ہے؟ اس سے علم کلام وجود میں آیا اور یہ محدثین کے ہاں پیدا ہوا، ابتدائی متکلمین سب کے سب محدثین تھے، امام احمد بن حنبل جنہوں نے سب سے پہلے کلام اللہ کے کلام اللہ ہونے کے عقلی اور منطقی تقاضوں کو سمجھا اور عقیدے میں اس کی اہمیت کا ادراک کیا اپنے وقت کے محدث اعظم تھے۔ پھر علم کلام نہیں بلکہ کلام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بہت سے مسائل علم حدیث کی دَین ہیں۔

علم سِیر علم حدیث کا ایک شعبہ تھا، پھر آگے چل کر ایک الگ فن بن گیا۔علم مغازی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات، جن پر مستقل کتابیں دوسری صدی ہجری میں تصنیف ہوئیں وہ علم حدیث کا ایک شعبہ تھا جو بعد میں الگ ہوا، علم سیر جو مسلمانوں کا بین الاقوامی قانون ہے جس پر دوسری صدی ہجری میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آج ایک درجن کتابیں دوسری صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہمارے پاس اس وقت مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ یہ ایک درجن کتب سب علم حدیث سے ماخوذ ہیں، گویا علم حدیث نے درجنوں علوم وفنون کو جنم دیا، جن میں اسلام کا بین

الاقوامی قانون بھی ہے جن پر ایک درجن کتابیں دوسری صدی ہجری میں لکھی جا چکی تھیں۔ آج دنیائے مغرب یہ سمجھتی ہے کہ بین الاقوامی قانون اُس نے دنیا کو دیا ہے۔ بین الاقوامی قانون مغرب نے دنیا کو نہیں دیا۔ مغرب کا قانون تو چار سو سال پرانا ہے۔ چار سو سال پہلے ایک ڈچ قانون دان ہوگو گروشیس (Hugo Grotious) نے سب سے پہلے بین الاقوامی قانون پر کتاب لکھی تھی، جس کے بارے میں اہلِ مغرب کا کہنا ہے کہ وہ Father of International law ''بین الاقوامی قانون کا باوا آدم'' ہے، لیکن ہوگو گروشیس کی پیدائش سے نو سو سال پہلے دوسری صدی ہجری کے فقہائے اسلام بین الاقوامی قانون پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ امام محمدؒ نے تین کتابیں لکھیں، امام ابوحنیفہؒ نے ایک کتاب لکھی۔ امام شافعی کی کتابیں اُن کی کتاب الام میں موجود ہیں۔ ابواسحاق فرازی نے کتاب لکھی، یہ ساری کتابیں آج مطبوعہ ہمارے پاس موجود ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ بین الاقوامی قانون یورپ کی عطا ہے درست نہیں ہے، یہ محدثین کی عطا ہے اور محدثین کے ہاتھوں یہ فن پیدا ہوا، یہ سارا فن یا علم جو مرتب ہو رہا تھا اس کی ترتیب کا آغاز تو صحابہ کرام کے ہاتھوں ہو گیا تھا۔

بعض لوگوں نے لکھنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو احادیث لکھنے کی ممانعت کر دی تھی اور صحابہ کرام نے حدیث کو نہیں لکھا، تابعین نے نہیں لکھا، تبع تابعین نے نہیں لکھا اور یہ قصے کہانیاں افسانے مسلمانوں میں مشہور تھے جیسے بازار میں قصے مشہور ہوتے ہیں، تیسری صدی ہجری میں کچھ لوگوں نے ان کو کتابوں کی شکل میں مرتب کر دیا، اِس سے بڑی جہالت اور اس سے بڑا جھوٹ ممکن نہیں، علم حدیث اور سنت قرآن پاک کی تفسیر وتشریح ہے، اگر قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ کرنے کا وعدہ کیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ قرآن پاک محفوظ ہو اور اس کی تفسیر محفوظ نہ ہو، قرآن پاک میں جس آیت میں وعدہ ہے اس میں ذِکر کا لفظ ہے ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ﴾ '' ہم نے اِس ذکر کو، اس یاددہانی کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کو محفوظ کرنے والے ہیں''، گویا صرف قرآن پاک کا متن محفوظ نہیں ہے، بلکہ قرآن پاک بہ طور یاددہانی کے محفوظ ہے، یاددہانی جب ہو سکتی ہے جب اس کا مفہوم معلوم ہو، مفہوم اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب اس کی تشریح وتفسیر معلوم ہو، تشریح وتفسیر اس وقت معلوم ہو سکتی ہے جب اس کی زبان معلوم ہو، آپ کے پاس کسی پرانی زبان کا لکھا ہوا کوئی نسخہ آ جائے تو شاید یہاں فیصل آباد شہر میں ایک بھی آدمی نہ

ملے جو اس کو سمجھ سکے، شاید پورے پاکستان میں سمجھنے والا کوئی نہ ہو۔ ہندوستان میں ایک آدھ شخص ایسا کوئی مل جائے تو مل جائے۔ تو اگر مخطوطہ موجود ہو، متن موجود ہو، زبان مٹ چکی ہو تو اس کی حفاظت بے معنی ہے۔ آج قدیم دنیا کے بہت سے کتبے نکلتے رہتے ہیں، دریافت ہوتے رہتے ہیں، اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اختلاف بھی رہتا ہے، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ محفوظ ہے، محفوظ ہونے کا معنی یہ ہے کہ متن بھی محفوظ ہو، ہر دور میں محفوظ رہا ہو، اس کے معنی اور مفاہیم بھی محفوظ ہوں، جس زبان میں بھیجا گیا ہے وہ بھی محفوظ ہو۔ اس زبان کو سمجھنے والے ہر دور اور ہر علاقے اور ہر زمانے میں موجود رہے ہوں، اُس پر عمل کرنے والے ہر دور میں رہے ہوں، محض نظری طور پر موجود رہے اور عمل میں موجود نہ ہو یہ بھی حفاظت نہیں ہے، مکمل حفاظت جب ہے۔ جب یہ ساری باتیں ہوں، یہ ساری باتیں ہر دور میں رہی ہوں، تو اگر قرآن پاک کو محفوظ مانتا ہے کوئی، قرآن پر عمل کرنے کا دعوے دار کوئی صاحبِ قرآن یا اہلِ قرآن ہونے کا مدعی اگر قرآن کو مانتا ہے تو اس کو یہ ساری چیزیں ماننی پڑیں گی، ان ساری چیزوں کو مانے بغیر قرآن مجید کی حفاظت اور الذکر کی حفاظت یا تو نامکمل ہے یا بے معنی ہے، اللہ تعالیٰ نامکمل کام نہیں کرتا، نعوذ باللہ وہ کیوں نامکمل کام کرے، وہ تو ﴿صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ﴾ ''ہر کام کو اتقان کے ساتھ کرتا ہے''۔ اگر اُس نے الذکر کی حفاظت کا وعدہ کیا تو اتقان کے ساتھ کیا۔ اتقان کا تقاضا ہے کہ یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے محفوظ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے سنت کی حفاظت کے متعدد طریقے چلے آرہے ہیں۔ ایک کی تو میں نے مثال دی کہ جب حضور علیہ السلام نے یہ آیت سنائی کہ نماز کا حکم دیا گیا ہے اسی وقت، اسی لمحے ہزاروں صحابہ نے نماز سیکھ لی، آج ہم اسی طریقے سے نماز ادا کرتے چلے آرہے ہیں، کسی صحابی نے یہاں ہاتھ باندھ کے (یعنی زیرِ ناف) پڑھی تو مسلمانوں میں یہاں ہاتھ باندھ کر پڑھنے والے موجود ہیں، کسی صحابی نے یہاں ہاتھ باندھ کر (یعنی سینے پر رکھ کے) پڑھی تو یہاں ہاتھ باندھ کر پڑھنے والے موجود ہیں، بعض صحابہ نے کسی وقت ہاتھ چھوڑ دیا شاید لمبی رکعات ہوگئیں، تھک گئے تو ہاتھ چھوڑ کے پڑھنے والے موجود ہیں جیسے مالکی ہاتھ چھوڑ کے پڑھتے ہیں۔ کسی نے آمین زور سے کہا تو زور سے کہنے والے موجود ہیں، آہستہ کہا تو آہستہ کہنے والے موجود ہیں، صحابہ کرام نے جس جس طریقے سے نماز پڑھی وہ سارے طریقے مسلمانوں میں موجود

ہیں۔ اِس تواتر اور تسلسل سے موجود ہیں کہ پوری نسل نے پچھلی نسل سے سیکھا، اس نسل نے اس سے پچھلی نسل سے اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچا، اس لیے سنت کی اصل حفاظت تو یہ ہے جو قرآن کی حفاظت ہے، جو قرآن کی محفوظیت ہے وہ سنت کی محفوظیت ہے، لیکن سنت کی محفوظیت اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح صحابہ کرام نے قرآن پاک کو لکھا اسی طرح صحابہ کرام نے سنت کے ذخائر کو بھی لکھا، اس بات پر بڑی تحقیق ہوئی ہے۔ صحابہ کرام کے دستِ مبارک سے لکھے ہوئے مجموعۂ احادیث کے کتنے نسخے موجود تھے، ہمارے برصغیر کے ایک بزرگ ہیں ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی ایک اور بزرگ ہیں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی ایک اور بزرگ ہیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ جن کا انتقال ہوگیا، ایک اور بزرگ تھے مولانا مناظر احسن گیلانی اور اِس طرح کے متعدد حضرات نے تحقیق سے یہ معلومات جمع کر کے ثابت کر دیا کہ صحابہ کرام میں کم از کم سو حضرات ایسے تھے جن کے اپنے مجموعے لکھے ہوئے یا ان کے تلامذہ کو Dictate کرائے ہوئے موجود تھے، ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ اس وقت تابعین میں سے جن حضرات کے مجموعے آج کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔

ایک مشہور محقق ہیں فواد سیزگین اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے ترک ہیں، جرمنی میں رہتے ہیں، جرمن زبان میں لکھتے ہیں، انہوں نے مستشرقین کا جب یہ اعتراض سنا، اعتراض کیا بلکہ ایک فضول اور لغو بیان پڑھا اور اس کو دہراتے مسلمانوں کو دیکھا کہ احادیث کے ذخیرے تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے تو انہوں نے اس تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور ایک ایک کتاب کے مخطوطات کو جمع کر کے جو نتیجہ نکالا وہ اتنا غیر معمولی ہے کہ آج کوئی مستشرق یہ اعتراض نہیں کرتا، دوسری نوعیت کے اعتراضات کرتے ہیں یہ اعتراض کوئی نہیں کرتا۔ انہوں نے امام بخاری کی صحیح بخاری کو بہ طور مثال کے لیا اور یہ ثابت کیا کہ امام بخاری نے جتنی احادیث اپنی کتاب میں بیان کی ہیں وہ سب زبانی اور تحریری دونوں طرح سے امام بخاری تک پہنچی تھیں، اس کے نمونے بیان کیے، فلاں کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے، فلاں صدی کی کتاب ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد تھے ہمام ابن منبہ، حضرت ابو ہریرہؓ نے ان کو حدیث کا ایک ذخیرہ املا (Dictate) کروایا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ ان کے پاس تحریری ذخائر موجود رہتے تھے اور وہ اِن تحریری ذخائر کی بنیاد پر اپنی یادداشت کو تازہ کرتے رہتے تھے،

ایک مرتبہ خلیفہ مروان بن الحکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی مجلس میں شرکت کی اور ساڑھے چار سو احادیث سنیں، پیچھے اپنے کاتب کو بٹھایا کہ لکھتے جاؤ، پیچھے اُن کا کاتب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نظروں سے دور ہو کر لکھتا گیا۔ ساڑھے چار سو احادیث سن کر چلے گئے، کئی سال بعد دوبارہ مدینہ منورہ آنا ہوا تو ان سے کہا پھر میں وہ احادیث سننا چاہتا ہوں اور کاتب سے کہا ذرا نوٹ کرو دیکھو۔ محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ساڑھے چار سو احادیث دوبارہ سنائیں، اس میں ایک نقطہ اور ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ جب وہ سارا سنا چکے تو مروان نے کہا کہ آج مجھے اطمینان ہوا ہے ورنہ دل میں یہ وسوسہ رہتا تھا کہ پتا نہیں آپ کی یادداشت کس حد تک ساتھ دے رہی ہے، انہوں نے کہا اچھا تم میرے ساتھ آؤ، خلیفہ کا ہاتھ پکڑا مدینہ منورہ کی گلیوں میں لے کے اپنے گھر گئے، گھر جا کے پورا ایک کمرہ دکھایا جن میں ان کی یادداشتوں کے ذخائر بھرے ہوئے موجود تھے کہ میں اس کو روزانہ یاد کرتا ہوں اور یاد کر کے حدیث بیان کرتا ہوں، جس دن مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرا حافظہ ساتھ نہیں دے رہا میں احادیث بیان کرنا چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے ہمام ابن منبہ کو احادیث کا مجموعہ Dictate کروایا۔ ہمام ابن منبہ کے شاگردوں میں بہت سے حضرات تھے جن میں سے ایک مشہور شاگرد تھے ابن شہاب زہری، ابن شہاب زہری نے جو احادیث ہمام ابن منبہ سے لیں وہ انہوں نے بہت سے شاگردوں کے ساتھ اپنے ایک شاگرد معمر ابن راشد کو املا کروائیں، معمر ابن راشد کی ایک کتاب مرتب موجود ہے ''الجامع''۔ معمر بن راشد نے بہت سی احادیث اپنے ایک شاگرد کو املا کروائیں ان کا نام ہے عبدالرزاق بن ہمام۔ عبدالرزاق بن ہمام کی کتاب ''مصنف'' مطبوعہ موجود ہے۔ عبدالرزاق کے شاگردوں میں سے بہت نمایاں ترین نام ہیں وہ امام بخاری کے اساتذہ میں سے متعدد حضرات ہیں، اب اگر امام بخاری ایک حدیث بیان کر رہے ہیں اور وہ حدیث عبدالرزاق کے مجموعے میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عبد الرزاق سے امام بخاری تک بالکل Exactiude کے ساتھ روایت پہنچی ہے، اس میں کوئی بھول چوک کا امکان نہیں، عبدالرزاق کی بیان کردہ روایت اگر بعینہٖ معمر بن راشد کی کتاب میں موجود ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہے کہ معمر بن راشد نے جس طرح عبدالرزاق کو دیا تھا اسی طرح سے محفوظ رکھا۔ اب معمر بن راشد کی کتاب میں جو روایات موجود ہیں اگر بعینہٖ وہ صحیفہ ہمام ابن منبہ میں بھی موجود ہیں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے جو بات اپنے شاگرد کو بتلائی تھی وہ امام بخاری تک اس ترتیب

سے پہنچی اور اس میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں، اس طرح انہوں نے ایک ایک روایت کا جائزہ لے کے یہ ثابت کیا اور بڑی ضخیم کتاب لکھی۔ یہ کہنا کہ احادیث کے مجموعے تیسری صدی ہجری کے ہیں وہ ہیں، اس لیے میں نے کہا کہ میں یہ عرض کروں گا کہ یہ مجموعے کیوں مقبول ہوئے، یہی کیفیت صحابہ کرام کی تھی۔ یہی کیفیت تابعین کے زمانے میں تھی، تابعین کے تین سو مجموعوں کی تفصیل ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے ایک کتاب میں دی ہے، ایک ایک مجموعے کی روایات کا جائزہ لے کے بتایا ہے کہ یہ مجموعہ کہاں تھا آج کس کتاب میں موجود ہے اور کہاں دست یاب ہے۔

جب تابعین سے معاملہ تبع تابعین تک آیا تو تبع تابعین نے ان کتابوں کو مجموعوں کی شکل میں مرتب کرنا شروع کر دیا۔ تابعین جس طرح احادیث مرتب کرتے تھے اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جس صحابی سے جو احادیث سنیں وہ ایک کتاب میں مرتب ہوگئیں، ہمام ابن منبہ نے جو سنا وہ ایک کتاب میں مرتب کر دیا۔ ہمام ابن منبہ نے کسی اور صحابی سے سنا وہ دوسری کتاب میں مرتب کر دیا، کسی اور سے سنا تو تیسری کتاب میں مرتب کر دیا۔ یہ مجموعے تابعین کے زمانے میں آئے، اب جب تبع تابعین کا زمانہ آیا تو تبع تابعین کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ کسی حدیث کے بارے میں یہ جاننا چاہیں کہ فلاں موضوع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک کیا ہے؟ اور ان کو یہ پتہ نہ ہو کہ یہ ارشاد کس صحابی سے مروی ہے تو ان کے لیے ان تین سو کتابوں میں سے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تبع تابعین نے ان تین سو کتابوں کو یا ان کی تعداد بہت زیادہ تھی تین سو تو وہ ہیں جن کا تذکرہ موجود ہے یا آج موجود ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر مضمون کے حساب سے مجموعے مرتب کیے، اس طرح سے ان کو مرتب کیا کہ وہ چیزیں یک جا ہو جائیں، اس لیے دوسری صدی ہجری میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ مسانید کہلاتی ہیں۔ مسند سے مراد وہ کتاب ہے جو صحابہ کرام کی ترتیب پر ہو، ایک صحابی کی ساری روایات ایک جگہ ہوں دوسرے صحابی کی اس کے بعد تیسرے کی اس کے بعد، تو حدیث کے وہ طلبہ یا علماء جن کو یہ معلوم ہے کہ فلاں حدیث فلاں صحابی سے مروی ہے وہ تو اس سے استفادہ کر سکتے ہیں دوسرے نہیں کر سکتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ ان تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر ان ہی احادیث کو اس طرح موضوعاتی ترتیب سے Subjectwise مرتب کیا جائے کہ طلبہ کے لیے جو اس پورے فن سے، ان چھ لاکھ آدمیوں کے تذکرے سے واقف نہیں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چیک کرنا یا کنفرم

کرنا یا *Verify* کرنا آسان ہو جائے،اس لیے یہ کام دوسری صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوا، امام مالک کی مؤطا اس کا پہلا نمونہ ہے،امام زید بن علی کی کتاب''المجموع''اس کا پہلا نمونہ ہے، دوسری صدی ہجری میں یہ کام شروع ہو گیا،لیکن جیسے جیسے مجموعے آتے گئے بڑے مجموعے تیار ہوتے گئے، جب یہ زمانہ امام بخاری،امام مسلم،امام ابوداؤد،امام ترمذی اور ان حضرات کا آیا تو وہ سارا ذخیرہ جو صحابہ وتابعین کے ذریعے سے آیا تھا وہ یک جا ہو گیا،اب اس کو چھانٹ کر *Classify* کر کے موضوعاتی ترتیب پر *Subjectwise* لکھنا آسان تھا،اس لیے ان حضرات نے اس کو *Subjectwise* مرتب کیا،اب جس کے مجموعے زیادہ *Scientific* تھے جس کے مجموعے زیادہ بہتر انداز میں مرتب تھے وہ مجموعے مقبول ہو گئے۔

چناں چہ امام بخاری کی کتاب جو صحت کے اعتبار سے سب سے اونچی ہے اور تفقہ کے اعتبار سے بڑی نمایاں ہے وہ سب سے مقبول قرار پائی،علم حدیث کا مقصد کیا ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں،عمل کرنے کے لیے ضروری ہے پہلے اس سے بصیرت حاصل کریں،اس بصیرت کو تفقہ کہتے ہیں،تو امام بخاری نے علم حدیث اور اس سے تفقہ کیسے پیدا کیا جائے،ان دونوں کو یک جا کر دیا۔اس لیے وہ مجموعہ ان مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوا جس میں صرف احادیث لکھی گئیں تھی تفقہ نہیں تھا یا صحابہ کی ترتیب سے تھیں *Subjectwise* نہیں تھیں۔

امام بخاری کے ہاں مختلف احادیث موضوع کے حساب سے مختلف ابواب میں ہیں۔ایک حدیث میں چار باتیں ہیں تو وہ چار ابواب کے تحت آ گئی۔اس میں نماز کا بھی ذکر ہے،اس میں قربانی کا بھی ہے،اس میں حج کا بھی ہے تو ایک حصہ نماز کے باب میں ہوگا،ایک قربانی کے باب میں ہوگا،ایک حج کے باب میں ہوگا ایک کسی اور باب میں ہوگا۔امام مسلم نے یہ کیا کہ تمام موضوعات سے متعلق احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا،اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ مبارک رفع یدین کرنے کا تھا یا نہیں تھا یا دونوں تھے۔اس کے بارے میں روایات میں کیا کیا آیا ہے وہ امام مسلم کے ہاں سب ایک جگہ میں مل جائے گا۔یہ خصوصیت اس کو حاصل ہے جو باقی مجموعوں کو حاصل نہیں ہے۔صحیح مسلم میں حدیث کی صحت کا التزام بھی ہے اور یہ التزام واہتمام بھی ہے۔

امام ابوداؤد نے یہ چاہا کہ احکام سے متعلق جتنی احادیث ہیں یعنی کچھ تو وہ ہیں جو اخلاقی

ہیں، کچھ میں پچھلی اقوام کی حکایات ہیں، کچھ ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، کچھ ہیں جو دعائیں سکھاتی ہیں، کچھ ہیں جس میں رقاق ہے یعنی کہ دل کو اللہ کے حضور بیدار کرنے کے لیے ہیں لیکن کچھ احادیث ہیں جو خالص عملی مسائل سے متعلق ہیں۔ امام ابوداؤد نے چاہا کہ عملی احادیث کو یکجا کر دیں اور اس کا ایک بڑا مجموعہ مرتب کر دیں۔ چناں چہ امام ابوداؤد پاکستانی نے کتاب السنن تیار کی اور سنن ابوداؤد کے نام سے مجموعہ جمع کر دیا۔ میں ابوداؤد کے نام کے ساتھ پاکستانی اس لیے لگاتا ہوں کہ وہ صحاح ستہ کے مؤلفین میں واحد مؤلف ہیں جن کا تعلق پاکستان سے ہے۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کا تعلق سیستان کے اس علاقے سے تھا مما یلی مکران والسند سیستان جس کو پہلے کہتے تھے اس کا ایک حصہ آج کل افغانستان میں ہے۔ ایک حصہ پاکستان میں اور تھوڑا سا حصہ ایران میں ہے، مکران سے جتنا اوپر ہے یہ سارا سیستان تھا تو مما یلی مکران والسند اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابوداؤدؒ کا تعلق خاران یا قلات یا ان میں سے کسی ضلع سے تھا یا چاغی اس لیے کہ مما یلی مکران والسند یہی علاقہ ہے، افغانستان کا علاقہ مما یلی مکران والسند نہیں ہے، اس لیے امام ابوداؤد رحمہ اللہ پاکستانی تھے، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث الباکستانی البلوشی، یہ ان کا پورا نام میرے خیال میں ہونا چاہئے، انہوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا، ان سے پہلے احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ موجود نہیں ہے، اس لیے کہ جو چھوٹے مجموعے تھے ان کے مقابلے میں یہ مقبول ہو گیا۔

امام ترمذی جن کا آج تذکرہ ہے انہوں نے ایک ایسی کتاب مرتب کی جو علم حدیث کے طلبہ کو حدیث پڑھانے کے ساتھ ساتھ علم حدیث کا بھی ماہر بناتی ہے، علم حدیث کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک علوم روایت ہے اور ایک علوم درایت۔ علوم درایت سے زیادہ دل چسپی فقہائے کرام نے لی، لیکن محدثین کے ہاں بھی اس میں مہارتیں موجود ہیں۔ امام ترمذی جب کسی موضوع پر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں یا بیان کرتے ہیں تو روایت کے اصول کے تحت جو ان کے نزدیک بہترین روایت ہوتی ہے، اس کو بیان کرتے ہیں۔ سب سے قوی سب سے مستند سب سے درست اور پھر کہتے ہیں وفی الباب عن فلان وفلان وفلان، اس موضوع پر فلاں فلاں صحابہ کی روایت بھی ہے تا کہ کوئی دیکھنا چاہے تو ان صحابہ کے مجموعوں میں تلاش کرے۔ میں نے عرض کیا کہ صحابہ کے نام سے مجموعے موجود تھے، آج بھی موجود ہیں ان صحابہ کی مرویات میں دیکھ لیں تو

مل جائیں گی۔ پھر امام ترمذی یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس مسئلے پر بڑے بڑے مجتہدین اور فقہائے کرام کا مسلک کیا ہے؟ امام شافعی کا، امام احمد کا، اہل کوفہ کا، اہل رائے کا، سفیان ثوری کا، تو طالب علم فقیہ بھی ہو جاتا ہے اور تقابلی فقہ سے بھی واقف ہو جاتا ہے، فقہا کے دلائل سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ پھر امام ترمذی رجال پر بھی بات کرتے ہیں۔ بقیہ کوئی محدث رجال پر بات نہیں کرتا کہ جو روایت میں نے جن راویوں سے لی ہے اس میں کون سا راوی کس درجے کا ہے۔ پھر راوی کے بارے میں کوئی خاص ہو تو وہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں کا بھائی ہے فلاں کا بیٹا ہے۔ فلاں کی یہ بہن ہے اس نے فلاں سے فلاں موقع پر پڑھا تھا، تو یہ معلومات جو امام ترمذی کے ہاں ہیں یہ اوروں کے ہاں نہیں ہیں اس لیے امام ترمذی کی کتاب مقبول ہوئی۔

پھر امام نسائی جو تاریخی اعتبار سے ان سب سے متاخر ہیں، ۳۰۳ھ میں اُن کی وفات ہے، ان کے ہاں صحت کا التزام بہت ہے کہ متن جسے آج کل ٹیکسٹ اسٹیبلش کرنا کہتے ہیں متن کی صحت کے التزام کے ساتھ احادیث کو بیان کیا جائے۔ یہ بات اور محدثین کے ہاں کم ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے محدثین نے سنن نسائی کا درجہ تیسرا بیان کیا ہے، سب سے پہلے صحیح بخاری، پھر صحیح مسلم پھر سنن نسائی، یہ بعض محدثین کی رائے اس لیے ہے کہ صحت کا جتنا التزام نسائی کے ہاں ہے کسی اور کے ہاں نہیں ہے، یہ پانچ کتابیں اتنی جامع اور مقبول تھیں اتنی خصوصیات کی حامل تھیں کہ بقیہ کتابوں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس لیے یہ پانچ کتابیں پہلے صحاح خمسہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بعد میں کچھ حضرات نے ایک چھٹی کتاب شامل کی۔ کسی نے مؤطا امام مالک کو سمجھا، کسی نے سنن دارمی کو سمجھا، لیکن بالآخر اتفاق رائے یہ ہوا کہ سنن ابن ماجہ چھٹی کتاب ہونی چاہئے اور سنن ابن ماجہ جو بہت سی خصوصیات میں ان کے قریب ہے اور بقیہ کتابوں سے نسبتاً بہتر ہے وہ چھٹی کتاب قرار پائی اور یہ صحاح ستہ حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں جو اپنی خصوصیات، اپنی ترتیب وتدوین کے اعتبار سے ان سے پہلی کتابوں سے ممتاز اور نمایاں ہیں زیادہ مفید ہیں، زیادہ آسان ہیں انگریزی میں زیادہ *Accessible* ہیں، ان سے استفادہ کرنا زیادہ *convenient* ہے، اس لیے یہ مقبول ہو گئیں اور بقیہ کتابیں زیادہ مقبول نہیں ہوئیں، لیکن وہ کتابیں مطبوعہ موجود ہیں، ہر کتب خانے میں موجود ہیں اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ کس زمانے میں لکھی گئیں، کس سن میں لکھی گئیں، ہر دور میں ان سے اعتنا رہا۔ ان ہی ڈاکٹر فواد سزگین نے جو ترک ہیں اور جن کا میں نے

ابھی ذکر کیا مخطوطات کا بھی جائزہ لیا ہے اور کتب حدیث کے مخطوطات ایک جگہ جمع کیے ہیں، پھر اوران مخطوطات کی تاریخ پر ایک ایک کر کے بات کی، پھران مخطوطات کی ایک مکمل فہرست اردن کے ایک ادارے نے تیار کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ آج کتب حدیث کے مخطوطات کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، اس میں صرف ایک کتاب صحیح مسلم کے اس وقت دنیا میں اڑھائی ہزار مخطوطات پائے جاتے ہیں۔ یہ اڑھائی ہزار مخطوطات ہر صدی کے ہیں، ایسے مخطوطات بھی ہیں جو امام مسلم کے سامنے پڑھے گئے، امام مسلم کے طلبہ ان کے سامنے بیٹھے تھے اسی نسخے کو سامنے رکھ کے پڑھ رہے تھے اور امام مسلم وہاں تشریف فرما تھے اور اس نسخے کو سن کے اس کی اجازت دے رہے تھے، اس محنت، دیانت، استناد دار علمی روایت کا بائبل والے تصور تک نہیں کر سکتے، یہودی اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ آج تورات کا کوئی ایسا نسخہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے لکھا ہوا موجود ہو اور ان کے سامنے پڑھا جا رہا ہو یا ان کے کسی شاگرد کے یا شاگردوں کے شاگرد کے سامنے پڑھا گیا ہے، کسی کے پاس ایسا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

ایک مرتبہ کچھ یہودیوں سے ملاقات ہوئی، ان کے ہاں مشہور ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے تھے، بعض یہودی حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے، سب نہیں، ایک طبقہ تھا جو مانتا تھا اور کیوں مانتا تھا؟ وہ اس طرح مانتا تھا کہ جب بخت نصر نے یہودیوں کو قتل عام کا نشانہ بنایا اور تورات کی تختیاں لے کے چلا گیا اور لے جا کے ضائع کر دیں، تورات تختیوں پہ لکھی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام تختیاں لائے تھے ﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ﴾۔ تختیاں لکھی ہوئی تھیں یاد کسی کو نہیں تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد تھیں یا نہیں یہ معلوم نہیں، کہیں ذکر نہیں آیا، لیکن باقی یہودیوں میں سے کسی کو یاد نہیں تھیں۔ تورات تختیوں پر لکھی ہوئی تھی، جب ضرورت ہوتی تو دیکھ لیا کرتے تھے، جب بخت نصر نے یہودیوں کا قتل عام کیا تو وہ تختیاں بھی ضائع ہو گئیں، اس کے بعد تورات دنیا میں موجود نہیں تھی۔ اس واقعے کے ایک ہزار سال بعد ان کے ہاں ایک کاہن پیدا ہوا جس کو وہ کاہن کہتے ہیں عزرا۔ عزرا کاہن جو اسلامی روایات میں عزیر کہلاتے ہیں، اس کاہن نے بہ قول ان کے اپنی یادداشت سے پوری تورات لکھوا دی، چوں کہ تورات یادداشت سے لکھوا دی اس لیے انہوں نے کہا ایسا آدمی تو اللہ کا بیٹا ہی ہو سکتا ہے جو اللہ کی کتاب کو اپنی یادداشت سے لکھوا دے تو میں نے ان یہودیوں سے کہا کہ اگر اللہ کی کتاب یادداشت سے لکھوا دینا

اس کا بیٹا ہونے کے لیے کافی ہے تو آپ کے خیال میں مسلمانوں میں کتنے بیٹے ہونے چاہئیں۔ آج ہی میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں سماعات لکھے ہوئے ہیں، تمام بڑے بڑے محدثین نے اس نسخے کو استعمال کیا ہے۔ اس پر شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے کتاب لکھی ہے۔ اس میں ان سارے سماعات کو نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر کے پاس وہ نسخہ تھا۔ حافظ مزی کے پاس وہ نسخہ تھا، ان سے پہلے متقدمین کے پاس وہ نسخہ تھا، اب جس نسخے کو حافظ مزی نے پڑھا ہو، حافظ مزی کا نام لوں تو بات لمبی ہو جائے گی، کوئی آدمی انسائیکلو پیڈیا نہیں ہو سکتا اگر حافظ مزی انسائیکلو پیڈیا نہیں تھے۔ کبھی کتب خانے میں جا کر دیکھیں ''الاکمال'' اتنی بڑی کتاب ہے، میں ہاتھ پھیلاؤں تو اس کتاب کی جلدیں میں اپنے ہاتھ میں سمیٹ نہیں سکتا جو انہوں نے تن تنہا بیٹھ کے لکھیں۔ ان کے سماعات اس میں موجود ہیں، اس سے یہ پتہ چلا کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان الفاظ کے نکلے ہوئے وقت سے لے کر اور آج اس لمحے تک جب بہ یک وقت لاکھوں اور کروڑوں انسان ان الفاظ سے اعتنا نہ کر رہے ہوں، ان کا درس وتدریس، ان کی تحقیق، تعلیق ایک ایک لفظ پر زبر زیر کے اعتبار سے غور ہوا کہ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ لفظ کس طرح نکلا تھا اور جس طرح سنا اسی طرح بیان کرنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ اگر استاد نے اپنے استاد کا نام لیا اور اس کی نسبت نہیں بیان کی تو شاگرد نسبت نہیں بیان کرے، مثلاً امام بخاری یہ کہیں کہ حدثنا محمد بن یحییٰ قال حدثنا فلان تو وہ یہ نہیں کہیں گے الذھلی، وہ کہیں گے وھو الذھلی۔ یہاں محمد بن یحییٰ سے مراد ذہلی ہیں۔ اس لیے نہیں کہیں گے کہ امام بخاری نے نہیں کہا تھا۔ شاگرد کو حق نہیں کہ اپنی طرف سے اضافہ کر دے۔ بہت جگہ ملے گا کہ قال سفیان وھو الثوری یہاں سفیان سے سفیان ثوری مراد ہیں۔ نیچے بیان کرنے والا اپنی طرف سے نہیں بڑھا سکتا کہ حدثنا سفیان الثوری یا حدثنا سفیان بن عیینہ کہیں گے حدثنا سفیان وھو ابن عیینہ۔ جو آدمی روایت یا راویوں کے ناموں کے بارے میں اتنی احتیاط کا ثبوت دے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے بارے میں بے احتیاطی کیسے کر سکتا ہے۔

احادیث کے ان مجموعوں کو دو وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی، ایک تو جامعیت، صحت اور حسن تدوین کی وجہ سے، دوسرے ان مجموعوں میں جو ذخیرہ احادیث آ گیا وہ احادیث کے تقریباً تمام مسائل کو حاوی ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ جزوی طور پر بعض الفاظ ایسے ہوں جو ان کتابوں میں نہ آ گئے

ہوں، لیکن احادیث میں جو تعلیم دی گئی، جو احکام دیئے گئے وہ سب کے سب اس میں آ گئے اور ان چھ کتابوں کو پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ علم حدیث جیسا کہ وہ ہے پورا کا پورا طالب علم کی گرفت میں آ جائے، اس لیے یہ کتابیں مقبول ہوئیں۔ بقیہ کتابیں درسی کتابیں نہیں تھیں۔ ظاہر ہے مسند امام احمد کی ضخیم جلدیں کون پڑھ سکتا ہے، طبرانی کی معجم کبیر کون پڑھ سکتا ہے، ابو یعلی کی مسند اتنی بڑی کون پڑھ سکتا ہے۔ اس لیے وہ کتابیں بہ طور حوالے کی کتاب کے رائج رہیں، ہر دور میں درسی اور ٹیکسٹ بک کے طور پر یہ کتابیں رائج ہوئیں بہ طور یہ کتابیں درسی بھی تھیں، یہ کتابیں قانون کا ماخذ بھی تھیں، ان کی ضرورت قاضی کو بھی تھی، مفتی کو بھی تھی، حکم رانوں کو بھی تھی، ایک زمانے میں ہر مسلمان کو ان کتابوں کی ضرورت تھی، اس لیے مختلف شرحیں اس کی لکھیں گئیں، کوئی شرح ادبی نقطہ نظر سے ہے، مثلاً کرمانی کی شرح مشہور ہے جو بخاری کی لغوی تشریحات سے عبارت ہے۔ کوئی شرح ہے روایتی نقطۂ نظر سے کہ علم روایت کے تقاضے ہیں اس کی نظر سے شرح لکھی جائے۔ مؤطا امام مالک کی شرح ہے ''التمہید''، ابن عبدالبر نے لکھی ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے اعلم أهل المغرب مسلم اسپین کے سب سے بڑے عالم وہ کہے جاتے تھے، انہوں نے التمہید لکھی، مؤطا امام مالک کی شرح علم روایت کے نقطہ نظر سے، پھر انہوں نے اس کتاب کی اور ایک شرح لکھی ''الاستذکار'' فقہی نقطہ نظر سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی دو شرحیں لکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف قارئین کے لیے، مختلف مقاصد کے لیے الگ الگ شرحیں بھی لکھی گئیں اور جامع شرحیں بھی لکھی گئیں، چناں چہ صحیح بخاری کی تقریباً دو سو شرحیں لکھی گئیں اور ہر دور میں لکھی جا رہی ہیں، خالص روایتی نقطہ نظر سے اور علم حدیث کے اعتبار سے تو بہترین شرح فتح الباری ہے، لیکن اور اعتبار سے بھی شرحیں ہیں۔

جامع ترمذی کو خاص اہمیت یہ حاصل تھی کہ جامع ترمذی جہاں احادیث احکام کا بہت بڑا مجموعہ ہے وہاں علم حدیث کے اس پورے *spectrum* کو پورے *crnvas* کو محیط ہے۔ جو آٹھ بڑے موضوعات علم حدیث کے ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں، پھر یہ کتاب محدث بناتی بھی ہے، علم حدیث کے ان ذخائر سے واقف کراتی ہے جو اس کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے ناموں کی وضاحت کرتی ہے، راویوں کے حالات بیان کرتی ہے۔ حدیث کا درجہ متعین کرتی ہے کہ حدیث کا درجہ کیا ہے روایتی نقطہ نظر سے۔ کسی اور محدث نے یہ التزام نہیں کیا۔

اس لیے اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، طلبہ کے نقطہ نظر سے، فقہا کے نقطہ نظر سے، عام محدثین کے نقطہ نظر سے۔ برصغیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں ترمذی پر جو کام ہوا ہے وہ برصغیر سے باہر نہیں ہوا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے ممکن ہے غلط ہو کہ جو درجہ صحیح بخاری کی شروح میں فتح الباری کو حاصل ہے وہی درجہ شروح ترمذی میں سے تحفۃ الاحوذی کو حاصل ہے۔ تحفۃ الاحوذی برصغیر میں لکھی گئی، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری نے لکھی ہے، لیکن جو خصائص فتح الباری کے ہیں کہ وہ خالص روایتی نقطہ نظر سے ہے علم حدیث کے جتنے علوم ہیں وہ سب اس میں آ گئے۔ فقہی اعتبار سے مزید گنجائش لوگوں نے محسوس کی۔ جن حضرات نے مزید گنجائش کام کرنے کی محسوس کی ان میں برصغیر کے اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے محدث رئیس المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیری بھی تھے، جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ مسلمانوں نے پچھلے پانچ سو سال میں اس درجے کا آدمی پیدا نہیں کیا اور علامہ اقبال سے ان کی بہت دوستی تھی، وہ لاہور تشریف لایا کرتے تھے اور علامہ اقبال سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ جامع ترمذی کی ایک ایسی شرح لکھی جائے کہ جس میں تمام حدیثی مباحث کا خلاصہ بھی ہو، جس میں تمام فقہی مباحث کا خلاصہ بھی ہو، جن میں تمام رجالی مباحث کا خلاصہ بھی ہو اور خاص طور پر فقہائے احناف کے جو دلائل ہیں علم حدیث کے نقطہ نظر سے اس پر خاص توجہ دی گئی ہو، لیکن علامہ انور شاہ کشمیری نے از خود کوئی شرح نہیں لکھی، ان کے امالی بہت سے حضرات نے مرتب کیے ہیں، ان کے امالی مرتب کرنے والے کئی حضرات ہیں، جن میں سے ایک مشہور نام تو ہمارے پاکستان کے مولانا محمد چراغ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، انہوں نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو مولانا انور شاہ کشمیری کے امالی پر مشتمل تھا، العرف الشذی کے نام سے، اس میں انہوں نے علامہ انور شاہ کشمیری کے امالی یعنی جب درس ان کا ہوتا تھا ترمذی کا تو نوٹس لکھ لیا کرتے تھے، اب استاد کے نوٹس درس کے دوران لینا یہ بڑا مشکل کام ہے، استاد اگر سو باتیں کہے تو پانچ آدمی نوٹ کر سکتا ہے۔ تیز سے تیز لکھنے والا ہو اور استاد بھی انور شاہ کشمیری جیسا ہو جس کا دریا کا بند کھل جائے تو پھر ختم نہ ہو، تو اس لیے ان کے جتنے امالی ہیں وہ سو فیصد لکھے نہیں جا سکتے، بہت تھوڑے لکھے گئے۔ ایک مجموعہ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی صاحب نے مرتب کیا جس کا کچھ حصہ چھپا ہے اور کچھ حصہ ابھی نہیں چھپا۔ کچھ اور حضرات کے پاس ذاتی طور پر امالی موجود ہیں۔ سب سے زیادہ جن کو کسب فیض کا موقع ملا وہ

میرے استاد مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تھے، جو سال ہا سال شاہ صاحب کے بہت قریب رہے۔ ان کے شاگرد بھی رہے ان کے خادم بھی رہے، ان کے اسسٹنٹ بھی رہے، معاون بھی رہے، مختلف حیثیتوں میں ان کے ساتھ رہے، ان کے انتقال تک ان کے ساتھ موجود تھے اور انہوں نے بارہا ان کے درس ترمذی میں شرکت کی۔ ان کے پاس یادداشتوں کا بڑا مجموعہ موجود تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ ان تمام یادداشتوں کی بنیاد پر ایک بڑا مجموعہ ان امالی کا مرتب ہو جائے، چناں چہ انہوں نے اپنی زندگی کے ایک دور میں ان کو لکھنا شروع کیا لیکن یہ بات میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا اس کی طباعت میں بہت متأمل تھے، ان کا کہنا تھا کہ پتا نہیں میں نے جو ان کی باتیں نوٹ کی ہیں وہ ساری مکمل ہوں گی کہ نہیں ہوں گی، کوئی بات غلط تو نہیں لکھ دی، کوئی بات یاد داشت میں غلط تو نہیں آ گئی تو میں استاد سے کیوں منسوب کروں، یہ ان کو تأمل رہتا تھا۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ اہل علم ان سے چھپوانے پر اصرار کر رہے ہیں، وہ تأمل کر رہے ہیں۔ بالآخر انہوں نے اس کو چھپوانے کی اجازت دے دی لیکن وہ مکمل نہیں ہو سکی، وہ کتاب الجنائز سے پہلے تک تھی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کام کو مکمل کیا جائے، جو علامہ انور شاہ کشمیری نے ۱۵-۱۹۱۴ء سے ترمذی پڑھانی شروع کی تھی اور آج ۲۰۰۸ء ہے۔ سو سال پورے ہونے والے ہیں، گویا سو سال سے یہ روایت جو چلی آ رہی تھی اس کو مکمل کرنے کی ضرورت تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ مولانا محمد زاہد صاحب اسے مرتب کر رہے ہیں تو مجھے بڑی خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی ہوئی، سچی بات ہے تھوڑی سی بدگمانی بھی ہوئی، لیکن انہوں نے جب کتاب کی ایک جلد بھیجی تو میں نے انہیں فون پر کہا کہ مجھے آپ کی کتاب نے مسخر کر لیا ہے، یہ کتاب علمی اعتبار سے انتہائی بلند پایہ ہے، اس کی زبان انتہائی معیاری ہے، احادیث کے جتنے مباحث ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں اور خاص طور پر جو کمی عام شروح حدیث میں ہے اس کا ازالہ کیا گیا ہے، ترمذی کی شروح میں اکثر نہیں ہے کہ جہاں امام ترمذی نے کہا کہ **وفی الباب عن فلان** تو وہ ساری روایات انہوں نے جمع کر دی ہیں جو اس باب میں موجود ہیں، کہیں میں نے گنا کہیں ساٹھ ہیں کہیں ستر ہیں کہیں پچاس ہیں کہیں چالیس ہیں۔ ایک ایک موضوع پر اتنی حدیثیں موجود ہیں وہ سب انہوں نے حوالے کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ اگر چہ یہ کام آسان بھی ہو گیا ہے تھوڑا سا، چوں کہ تخریج پر بہت سی کتابیں شائع ہو گئیں ہیں۔ اسلاف کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں تو اگر

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے سامنے یہ سب کتابیں موجود ہوتیں وہ بھی یہ کام کرتے ،لیکن اس زمانے میں کتابیں دست یاب نہیں تھیں، مخطوطات تھے، ملتے نہیں تھے،اب ساری کتابیں چھپ گئیں ہیں،اب نیٹ پر بھی آ گئی ہیں، سی ڈی پر آ گئی ہیں تو آج تخریج کرنا آسان ہے۔ ممکن ہے یہ کام اللہ تعالیٰ نے اسی لیے روکے رکھا ہو۔ یہ اس کتاب کی بڑی خوبی ہے۔ دوسرے انہوں نے یہ کیا کہ ہر باب کے شروع میں اس کے مباحث کا بڑا جامع خلاصہ بیان کیا ہے، جو اکثر قدیم شرحوں میں نہیں ہے،اور پاکستان میں ہمارے دوست مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اس طرز کے موجد ہیں، انہوں نے سب سے پہلے تکملہ فتح الملہم میں یہ کام کیا تھا،جس کی بہت کام یاب پیروی مولانا زاہد صاحب نے کی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کام کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر میں نے آپ کا وقت زیادہ لے لیا تو معذرت چاہتا ہوں، بات اگر کوئی غیر مرتب رہی تو وہ میری کم علمی کی وجہ سے ہوئی، اگر مفید ہوئی تو علم حدیث کی برکت کی وجہ سے ہوئی اور مولانا زاہد صاحب کے اخلاصِ نیت کی وجہ سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

اخلاق نبوی ﷺ کے دس اہم پہلوؤں پر عصرِ حاضر کے حوالے سے قیمتی تحریر

پیغام سیرت

سید فضل الرحمٰن

صفحات: ۲۸۰ قیمت: ۲۲۰ روپے

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴۔ کراچی۔ فون: 021-3668479